اکائی 3 دکن میں اردو قصیدہ کا ارتقا

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 دکن میں اردو قصیدہ کا ارتقا

3.3.1 دکن میں اردو قصیدہ گوئی کا پس منظر

3.3.2 دکن کے ابتدائی قصائد

3.3.3 دکن میں اُردو قصیدہ کا ارتقا

3.3.4 ماحصل

3.4 آپ نے کیا سیکھا؟

3.5 اپنا امتحان خود لیجیے

3.6 سوالوں کے جوابات

3.7 فرہنگ

3.8 کتب برائے مطالعہ

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- دکن میں اُردو قصیدے کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔
- دکن کے ابتدائی قصائد سے متعارف ہوں گے۔
- دکن میں اُردو قصیدہ نگاری کی روایت اور اس کے ارتقا سے بحث کریں گے۔
- دکن کے اہم قصیدہ نگاروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- دکن کی اُردو قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات کو سمجھیں گے۔

3.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائیوں میں آپ نے قصیدے کے لغوی اور اصطلاحی معنی ومفہوم، اجزاے ترکیبی اور اس کی فنی خصوصیات سے آگہی حاصل کی، ساتھ ہی اس کی اقسام، موضوعات اور ادبی وتہذیبی اہمیت کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ دکن میں اُردو قصیدے کے پس منظر سے واقف ہوں گے، اس کی روایت اور ارتقا سے بحث کریں

گے، دکن کے اہم قصیدہ نگاروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور دکن کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھیں گے۔

3.3 دکن میں اُردو قصیدہ کا ارتقا

3.3.1 دکن میں اُردو قصیدہ گوئی کا پس منظر

اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں قصیدہ گوئی کی کوئی خاص روایت نظر نہیں آتی۔ حالاں کہ اُردو شعرا کے سامنے فارسی قصیدے بہ طور نمونہ ابتدا سے ہی موجود تھے۔ محققین نے اس کے کئی اسباب بیان کیے ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ صنفِ قصیدہ کا بنیادی تعلق مدح سے ہے اور دکن میں اکثر و بیش تر شعرا یا تو سلاطین تھے یا پھر صوفی و سالک۔ ایسے میں سلاطین کس کی مدح کرتے اور صوفی و سالک شعرا کو کسی بادشاہ یا سلطان کی مدح و ستائش کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ دوسرا سبب بعض محققین نے یہ بتایا ہے کہ چوں کہ زبان اپنی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھی، ایسے میں قصیدہ جیسی صنف میں طبع آزمائی کرنا قدرے مشکل امر تھا کیوں کہ قصیدے کو وسیع زبان درکار ہوتی ہے جس میں الفاظ کی کمی نہ ہو اور شاعر اپنے ممدوح کی مدح کرتے وقت الفاظ کے قصر تعمیر کرنے میں کسی بھی طرح کی پریشانی محسوس نہ کرے۔ زبان و بیان کی دقت کے علاوہ محققین نے دکن میں قصیدہ کے زیادہ فروغ نہ پانے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ دکنی سلاطین کا تعلق شیعہ مکتبِ فکر سے تھا، اس لیے ان کے نزدیک مرثیوں کی وقعت زیادہ تھی اور مرثیہ گوئی سے شاہی قرب اور اعزاز و انعام حاصل ہوتا تھا۔ ساتھ ہی مرثیوں میں ائمۂ کرام کی مدح و توصیف بھی بیان کی جاتی تھی۔ اسی لیے قصیدہ کی خاص ضرورت باقی نہ رہی۔ ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چوں کہ وہاں قصیدہ نگاری کا کام مثنویوں سے لیا جاتا تھا، اس لیے قصیدہ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس وقت مثنوی نگاری ہی دربار میں مقام و مرتبہ اور اعزاز حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔ اسی لیے بیش تر مثنویوں کے آغاز میں بادشاہ وقت کی تعریف میں اشعار ملتے ہیں۔ بعض شعرا نے قصیدہ تحریر بھی کیا تو مثنوی کی ہیئت میں۔ جیسا کہ محققین نے کلیات بحرؔی کی مثال پیش کی ہے جس میں عنوان قصیدے کا اور ہیئت مثنوی کی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے:

> ''قصیدے اور بعض دوسری اصناف میں درباری زندگی کو کافی دخل حاصل ہے۔ چوں کہ اس عہد میں (عہدِ عادل شاہی، سولھویں صدی) دکنی شاعری درباری اثر سے محفوظ تھی، اس لیے قصیدے نہیں ملتے۔''
>
> (ڈاکٹر نذیر احمد، علی گڑھ تاریخ ادب اُردو (پہلی جلد)، شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص: ۲۴۹)

شاید یہی سبب ہے کہ پروفیسر محمود الٰہی نے اپنی تحقیقی کتاب میں بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی ادوار میں بہ طورِ صنفِ سخن قصیدے کے وجود سے انکار کیا ہے۔ حالاں کہ دکنی محققین نے بہمنی سلطنت کے زمانے کے شیخ آذری، مشتاقؔ اور لطفیؔ جیسے شعرا کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض کے یہاں قصائد کے نمونے ملتے ہیں۔ اگرچہ ان شعرا کے بارے میں معلومات محدود ہیں تاہم کئی محققین نے ان کا ذکر کیا ہے اور نصیر الدین ہاشمی نے مشتاقؔ اور لطفیؔ کو بہمنی دورِ حکومت کا شاعر قرار دیتے ہوئے ان کے قصائد کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔

3.3.2 دکن کے ابتدائی قصائد

دکن میں قصیدہ گوئی کی روایت کا آغاز مشتاقؔ اور لطفیؔ سے ہوتا ہے جن کے قصائد کے نمونے دستیاب ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض مثنویوں یا دوسری تحریروں میں بھی قصیدے کے عناصر موجود تھے۔ مثلاً مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' میں سلطان علاء الدین بہمنی کی مدح میں اشعار ملتے ہیں۔ قطب الدین قادری کے 'سیرت نامہ' میں اس کے ممدوح شیخ طریقت محمد ابراہیم مخدوم کی شان میں اشعار کا نذرانہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح قطب شاہی دور کے شاعر احمد گجراتی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی مدح میں اشعار ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگرچہ بہ طور صنفِ سخن قصیدے کا رواج دکن میں ابتدائی دنوں میں نہیں ہوسکا تاہم اس دور کی مثنویوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن کو اگر علاحدہ کرکے رکھا جائے تو ان پر قصیدے کا گمان گزرے گا۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اپنے مضمون 'اُردو میں قصیدہ نگاری کا آغاز وارتقا' میں پروفیسر سیدہ جعفر کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

> ''دکنی مثنویوں میں پیش کیے ہوئے یہ مدحیہ اشعار قصائد نہیں کہلائے جاسکتے لیکن ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شعرائے دکن میں مدحیہ شعر گوئی کا جوہر موجود تھا اور انھوں نے قصائد کے علاوہ مثنوی میں بھی جہاں ضرورت سمجھی، اس کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری میں قصیدہ صرف اپنے موضوع ہی سے پہچانا نہیں جاتا بلکہ اپنی ہیئت اور مقاصد اور اپنے سانچے کے ساتھ ادبی افق پر نمودار ہوتا ہے۔ قصیدے میں ہیئت اور مواد ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہیں کہ ان کے بغیر اس صنفِ سخن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ صرف مدح کے موضوع کو پیش نظر رکھ کر جن ادبی شکلوں میں مدحیہ اشعار موجود ہوں، انھیں قصیدے سے تعبیر کرنا ایک صریح غلطی ہوگی۔''
>
> (سیدہ جعفر، دکنی ادب میں قصیدے کی روایت، ص:۶۶، بحوالہ غزل، قصیدہ اور رُباعی، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد، ص:۱۹۲)

محققین نے دکنی شاعری کے مدحیہ پہلو کو قصیدے کی روایت سے جوڑا ہے اور انھیں ہی دکنی شاعری میں قصیدے کا نقش اول قرار دیا ہے۔ دکنیات کے ماہر ڈاکٹر محمد علی اثر غواصؔی سے متعلق اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''دکنی کے اولین قصائد بیش تر صوفیوں اور مذہبی رہنماؤں کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر قصائد ایسے ہیں جن میں قصیدے کے فارم کی پابندی نہیں کی گئی ہے جو فارسی میں مروج تھا، بلکہ قدیم اُردو کے متعدد قصیدے مثنوی کے فارم میں لکھے گئے۔ بعد کو فارسی میں قصیدوں کا مروجہ فارم دکن میں بھی مقبول ہونے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدا ہی سے دکن میں قصیدے کا فارم اور اس کی مخصوص ہیئت کو شعرا نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنایا تھا۔ اس سلسلے میں مشتاقؔ اور لطفیؔ کے کلام سے قصیدے کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جنھیں بہمنی دور کے شعرا بتایا گیا ہے۔''
>
> (ڈاکٹر محمد علی اثر، غواصؔی: شخصیت اور فن، مکتبہ شعر و حکمت، حیدرآباد، ۱۹۷۷ء، ص:۱۲۸)

مشتاقؔ نے ایک قصیدہ سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ کی تعریف و توصیف میں لکھا ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

ناز کا اے طرز ہے کھینچے وفا پر قلم　　غمزہ کا اے طور ہے گود میں پالے ستم

لطف سخن یوں اہے شہد جیوں نیش میں　　راکھے قہر مہر میں شیریں میں راکھے اوسم

فتنہ شجاعت کا دیکھ رستم دستا چھپا　　شور سخاوت کا سن ہوگیا حاتم اصم

نصیرالدین ہاشمی نے بھی اپنی کتاب 'دکن میں اُردو' میں مشتاقؔ کے اس قصیدے کے اشعار بہ طور نمونہ درج کیے ہیں جو اس نے خواجوئے کرمانی کے فارسی قصیدے کی زمین میں کہا ہے۔ لطفیؔ کے قصائد کے نمونے بھی موجود ہیں البتہ شیخ آذریؔ کے قصیدوں کے بارے میں کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اُردو' میں یہ تو بتایا ہے کہ آذریؔ نے قصیدے لکھے تھے لیکن ان کا کوئی نمونۂ کلام یا ان کے اشعار درج نہیں کیے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر ابو محمد سحر نے یہ قیاس لگایا ہے کہ چوں کہ آذریؔ نو وارد ایرانی شاعر تھے، اس لیے زیادہ امکان یہ ہے کہ انھوں نے فارسی میں قصیدہ کہا ہو، اُردو میں نہیں۔ البتہ ان ابتدائی تفصیلات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دکن میں بہمنی دور میں قصیدہ گوئی کی روایت شروع ہوگئی تھی، اس لیے ڈاکٹر نذیر احمد یا پروفیسر محمود الٰہی کی باتوں کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ نصیرالدین ہاشمی نے بہمنی دور میں شعر و ادب کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس دور میں مثنوی کے ساتھ غزل اور قصیدے بھی لکھے گئے۔ شاعری میں بحر، قافیہ اور ردیف کا تتبع کیا جاتا تھا۔... قصیدوں میں جو لوازم اس کے مخصوص تھے، یعنی تمہید، گریز، مدح اور خاتمہ ان ہی کی پابندی کی جاتی تھی۔''

(نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اُردو، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص:۳۷)

یہاں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر چہ دکن میں اُردو قصیدہ نگاری پر خصوصی توجہ نہیں دی گئی تاہم قصیدوں کے اثرات دکنی شاعری میں بکثرت موجود ہیں اور کئی اہم شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔

3.3.3 دکن میں اُردو قصیدہ کا ارتقا

دکن میں اُردو قصیدہ کا اصل سفر بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد شروع ہوتا ہے جب قطب شاہی اور عادل شاہی جیسی علم دوست سلطنتیں وجود میں آئیں۔ ان سلطنتوں کے ساتھ خاص بات یہ رہی کہ ان کے سلاطین خود باذوق شعرا گزرے ہیں اور اسی سبب انھوں نے شعر وادب کی خوب خدمات انجام دی ہیں۔ دکن میں قصیدہ گو کی حیثیت سے نمایاں کارنامہ انجام دینے والا شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے جس نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اور اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار پایا۔ قلی قطب شاہ نے صنفِ قصیدہ کی طرف باضابطہ توجہ دی۔ شاید اسی سبب بعض ماہرینِ علم وادب نے اسے اُردو کا پہلا قصیدہ گو شاعر تسلیم کیا ہے۔ اس کے کلیات میں کل بارہ قصیدے شامل ہیں جن میں سے چھے نامکمل ہیں۔ اس کے کلیات میں حمد ونعت کے ساتھ ساتھ عید، عید قربان، عید میلاد النبی، نوروز اور بسنت جیسے موضوعات پر قصیدے شامل ہیں۔ 'باغِ محمد شاہی' کی تعریف میں بھی اس نے ایک بہترین قصیدہ تحریر کیا ہے۔ اگر چہ یہ نظمیں مکمل طور پر قصیدے کی تعریف پر پورا نہیں اُترتیں، البتہ ان کی تشبیبوں نے بیش تر ناقدین کی توجہ حاصل کی ہے۔

قلی قطب شاہ کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ ظل اللہ نے بھی قصیدے لکھے تھے مگر ان کا نمونۂ کلام دستیاب نہیں ہے۔ یہ قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد بھی تھا۔ قطب شاہی سلطنت کے سلطان اور محمد قلی قطب شاہ کے نواسے عبداللہ قطب شاہ نے بھی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اس کے کلیات میں قصائد بھی شامل ہیں۔ بسنت، مرگ، ٹھنڈ کالا وغیرہ پر اس کی مدحیہ نظمیں قصیدے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اس کی مدحیہ نظموں میں مذہبی رنگ وآہنگ بھی نظر آتا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی کے مطابق اس کے 'کلام میں لفظی شان وشوکت، زبان کی سلاست خاص طور پر قابلِ ذکر ہے'۔ عشرت محل نام کے ایک محل سے متعلق اس کی مدحیہ نظم کے چند اشعار دیکھیے:

یو دلکشا عشرت محل مطبوع اوتارا ہوا　　جوتی زمیں کی پیٹھ پر جیوں مشتری تارا ہوا

ہر طاق یاں خوش طرح کا دستا دریچہ فرح کا　　عاجز ہو اس کی شرح کا حیران سنسارا ہوا

عبداللہ قطب شاہ کے ہم عصر شعرا میں ایک شاعر ملا قطبی گزرا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے قیاس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالباً اس کا نام قطب الدین تھا۔ اس نے اپنے پیر و مرشد شاہ ابوالحسن بیدرؔی کے مشورے پر ۱۰۴۵ھ میں خواجہ یوسف کے فارسی قصیدے 'تحفۃ النصائح' کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اس قصیدے میں مذہبی احکامات و آداب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۷۸۶ ابیات ہیں اور قطبی نے ان کا فارسی زمین میں من وعن ترجمہ کیا ہے اور اس میں وہ بہت حد تک کام یاب بھی ہے۔ ان شعرا کے بعد قصیدہ گوئی کی روایت میں محمد افضلؔ اور غواصیؔ کا نام آتا ہے۔ افضلؔ بھی بیجاپور کا قادرالکلام شاعر گزرا ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں اس کے اشعار موجود ہیں اور انھیں پڑھ کر فنِ قصیدہ گوئی پر اس کی دسترس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ غواصیؔ بیجاپور کا ملک الشعرا رہا ہے۔ وہ دکن کے نمائندہ شعرا میں سے ہے جس نے نہ صرف یہ کہ کام یاب اور مشہور ترین مثنویاں تحریر کی ہیں بلکہ غزلوں کے علاوہ قصیدے، رُباعیاں اور دیگر اصنافِ سخن میں بھی اپنی صلاحیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کے کلیات میں ۲۱ قصائد شامل ہیں۔ حالاں کہ محققین کے مطابق اس کے قلمی نسخے میں ۳۵ قصائد تھے جن میں سے بعض قصائد کو اس کے ناقص الاشعار ہونے یا دیگر شعرا کے کلام کا اشتباہ ہونے کے سبب کلیات میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ وہ باکمال قصیدہ گو رہا ہے جس نے فارسی کے مقبول قصیدہ گو شاعر ظہیرؔ فاریابی اور کمال خجندیؔ وغیرہ کی زمینوں میں قصیدے لکھے اور اپنے تخلیقی جوہر کا کام یاب مظاہرہ کیا۔ غواصیؔ کے یہ تمام قصائد عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں ہیں۔ اس نے ایک قصیدہ منقبت علیؓ میں اور ایک قصیدہ باری تعالیٰ کی تحمید میں تحریر کیا ہے، البتہ ان دونوں قصائد میں بھی بادشاہ کی تعریف کا موقع اور جواز نکال لیا ہے۔ غواصیؔ کے قصیدے فنِ قصیدہ گوئی پر اس کی دسترس کا ثبوت ہیں۔ اس کے قصیدوں کی تشبیب یا گریز میں بھرپور فن کاری نظر آتی ہے۔ اس کی مدح سرائی بھی قابلِ تعریف ہے۔ اس عنصر میں اس پر فارسی شعرا کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں جو دیگر دکنی شعرا کے یہاں نظر نہیں آتا۔ عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں کہے گئے اس کے یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

اگر گدا کوں ترا لطف بات پکڑے آج　　تو پل میں اس کو شہنشاہ روم و شام کرے

جو فرد جاہ سو تو گھر منے تھے نکلے بھار　　تو سور گھن تھے اتر آتجے سلام کرے

ڈاکٹر زورؔ نے غواصیؔ کے قصیدوں کی ادبی اہمیت و وقعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''غزلوں کے بعد کلیات غواصیؔ کے ۳۵ قصائد بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس لیے کہ اتنے زیادہ اور اتنے طویل اور اتنے عمدہ قصائد کسی دکنی شاعر کے اب تک

دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ یوں تو محمد قلی، نصرتی، افضل اور ولی وغیرہ کے قصائد موجود ہیں مگر تعداد اور تنوع کے لحاظ سے موجودہ معلومات کی حد تک غواصی دکن کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ثابت ہوتا ہے۔''

(علی گڑھ تاریخ اُردو ادب، جلد اول، ص:۳۹۴)

عاشق دکھنی کا شمار ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے شعرا میں ہوتا ہے۔ بیجاپور کے اس شاعر کا ایک قصیدہ 'حضرت شاہ صبغۃ اللہ' کی مدح وتوصیف میں ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے اسے اُس دور کا پہلا قصیدہ قرار دیا ہے۔ اس قصیدے کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

اس دور میں نیں ہے ولی کوئی صبغۃ اللہ سار کا — مُرشد مرا کامل ہے او ہور پیر ہے ہنکار کا

تیرے فقیراں کوں سدا الفقر فخری کا ہے دم — ہر اک ولی خدمت کرے لے بھیس خدمت گار کا

دکن کے قصیدہ گو شعرا میں علی عادل شاہ ثانی شاہی کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس کا کلیات دستیاب ہے جس میں دیگر اصناف کے علاوہ چھے قصیدے بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ایک حمدیہ قصیدہ اور دو منقبتی قصائد ہیں۔ منقبتی قصائد میں ایک قصیدہ حضرت علیؓ کی مدح میں ہے جب کہ دوسرے قصیدے میں بارہ اماموں کی منقبت میں شعر کہے گئے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس قصیدے کا نام 'در منقبتِ دوازدہ امام' ہے۔ اس کا ایک قصیدہ علی دادمحل کی تعریف میں ہے جس کا عنوان قصیدۂ حمل جمل ہے اور یہ ایک لامیہ قصیدہ ہے۔ ایک اور قصیدہ 'چار در چار' کے نام سے ہے جس میں عشق کے ایک واقعے کو پیش کیا گیا ہے۔ شاہی کے قصائد میں فن قصیدہ نگاری کی لوازمات اور عناصر کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس کا اسلوب دل کش ہے اور اس کی شاعری جذبے اور خلوص وصداقت کی آئینہ دار ہے۔ اس نے اگر مشکل زمینوں میں شعر نظم کیے ہیں تو آسان بحروں میں بھی فن کاری دکھائی ہے۔ عبدالقادر سروری نے شاہی کے فن کو سراہا ہے اور اس کی قصیدہ نگاری کی بابت کہا ہے کہ ''شاہی کا کلام لطفِ زبان، تخئیل کی بلند پروازی، اسلوب کی جدت اور طرزِ ادا کی ندرت کے اعتبار سے اپنا ایک مقام رکھتا ہے''۔

دکن کے جن شعرا کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں ایک اہم نام نصرتی کا ہے۔ اُردو قصیدہ کی تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ وہ عادل شاہ ثانی کے دربار سے منسلک تھا اور 'ملک الشعرا' کے مسند پر مکین تھا۔ مثنوی 'علی نامہ' اور 'گلشن عشق' اس کے شان دار کارنامے ہیں جن پر اُردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ پروفیسر محمود الٰہی کے مطابق نصرتی نے کل بارہ قصیدے تحریر کیے ہیں۔ اس کی مثنوی 'علی نامہ' میں ہی سات قصائد شامل ہیں۔ اس نے اپنے سلطان علی عادل شاہ کی مدح میں علاحدہ ایک قصیدہ تحریر کیا ہے۔ معراج کے بیان میں ایک طویل قصیدہ اس کی یادگار ہے۔ اس قصیدے کے آخر میں اس نے محمد عادل شاہ کی مدح وستائش میں بھی اشعار قلم

بند کیے ہیں۔ نصرتی نے مدحیہ قصیدوں کے ساتھ ساتھ ہجویہ قصائد بھی تحریر کیے ہیں۔ عربی قصائد میں گھوڑوں کی تعریف و توصیف میں اشعار نظم کیے جاتے تھے اور نصرتی نے ایک گھوڑے کی مذمت میں قصیدہ لکھا ہے۔ عربی قصائد کی طرح اس کے قصیدوں میں بھی جنگ کے واقعات اور مظاہرِ قدرت وغیرہ سے متعلق بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ ماہرینِ فن نے لکھا ہے کہ اس کی مثنوی میں مختلف عنوانات کے ذیل میں درج اشعار کو اگر ایک جگہ مرتب کر دیا جائے تو ایک بہترین قصیدہ تیار ہو جائے گا۔ نصرتی نے موسمِ سرما یا ٹھنڈ کالے پر بھی قصیدہ تحریر کیا ہے جسے بقول پروفیسر محمود الٰہی ''سعدی کے بہاریہ قصیدوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے''۔ دکن میں زیادہ طویل قصیدوں کی روایت نہیں ملتی، البتہ 'علی نامہ' میں مذکور کئی قصائد قدرے طویل ہیں جن میں سو سے زائد اشعار ملتے ہیں۔ فتحِ ملنار پر اس نے ایک قصیدہ تحریر کیا ہے جس میں ۲۲۰ اشعار ہیں۔ اس کے قصائد میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور رزمیہ شاعری کا پہلو انتہائی متاثر کن ہے اور یہ صورت اُردو کے کسی اور قصیدہ گو شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ اکثر ماہرینِ ادب نے نصرتی کے قصائد کی اہمیت و انفرادیت سے بحث کرتے ہوئے اسے اُردوئے قدیم اور دکن کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر قرار دیا ہے۔ بادشاہ کی تلوار کی تعریف میں اس کا یہ شعر دیکھیے:

جب تے جھلک دیکھا اوک سورج تری تروار کا　　تب تے لگیا تھر کاپنے ہو پُر عرق یکبار کا

نصرتی کے عہد کے ایک اور شاعر سید میران ہاشمی کے یہاں بھی قصیدے ملتے ہیں۔ اس نے مغلیہ صوبہ دار ذوالفقار خاں کی مدح و توصیف میں قصیدہ کہا ہے جس میں جنگی واقعات کی خوب صورت مرقع کشی ملتی ہے۔ گجراتی شاعر امین جس نے مشہور مثنوی 'بہرام و حسن بانو' کی تخلیق کی تھی، اس نے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ اس کے نعتیہ قصیدے کے اشعار 'اُردوئے قدیم' کے مؤلف نے پیش کیے ہیں۔ قاضی محمود بحری بڑے شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے بھی قصیدے لکھے مگر وہ دستیاب نہیں ہیں۔ مشہور ترین 'قصیدۂ بردہ' کا ترجمہ بھی دکنی زبان میں کیا گیا تھا۔ سید محمد رضا نے یہ ترجمہ کر کے خوب شہرت حاصل کی۔ بعض محققین نے شاہ تراب نامی شاعر کا ذکر کیا ہے جس کا وطن مدراس تھا۔ اس نے حضرت علیؓ کی مدح و توصیف میں قصیدے لکھے۔ ڈاکٹر نور السعید اختر نے لکھا ہے کہ ''اس کے قصیدوں میں نجوم اور علمِ رمل کی اصطلاحات ملتی ہیں''۔ امین الدین اعلیٰ مشہور بزرگ برہان الدین جانم کے بیٹے تھے۔ انھوں نے نظم و نثر میں کئی تخلیقات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کے کلام میں قصیدے بھی ملتے ہیں۔ 'محبت نامہ' میں نعتیہ اشعار میں قصیدے کا رنگ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے والد شاہ برہان الدین جانم کی مدح میں بھی ایک قصیدہ تحریر کیا جس میں قصیدے کا انداز و اسلوب جھلکتا ہے۔

دکن میں اُردو شاعری کے منظر نامے پر ایک نمایاں نام ولی دکنی کا ہے جسے اُردو شاعری کا باوا آدم بھی کہا جاتا ہے۔ شمالی ہند میں اس کا اُردو دیوان پہنچنے کے بعد اُردو شاعری میں جو چمک پیدا ہوئی، وہ اس سے قبل مفقود تھی۔ ولی نے غزل گوئی میں نام کمایا تاہم اس نے قصیدے بھی تحریر کیے۔ وہ قصیدہ گوئی میں خود کو خاقانی، انوری اور عرفی کا

ہم نوا سمجھتا تھا۔اس کے کلیات میں چھے قصائد ملتے ہیں۔سب سے طویل قصیدہ حمد ونعت پر مشتمل ہے جس میں ۱۲۳ ابیات ہیں۔مختصر ترین قصیدہ بیس اشعار پر مشتمل ہے جس میں خانۂ کعبہ کی تعریف کی گئی ہے۔اس کے بقیہ قصائد بھی نعتیہ اور منقبتی نوعیت کے ہیں۔اس نے ایک قصیدہ پیران طریقت میران محی الدین کی مدح میں جب کہ ایک اور قصیدہ شاہ وجیہہ الدین کی مدح میں تحریر کیا ہے۔اس کے قصیدوں پر فارسی قصائد کے اثرات نمایاں ہیں۔ولؔی کے قصیدے کی زبان غزل کی زبان سے الگ ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے قصیدے میں پرشکوہ زبان کے استعمال کیے جانے کی ضرورت کو شعوری طور پر برتا ہے۔اس کے قصیدوں کی ادبی اہمیت اور فنی وقعت پر بحث کی گنجائش برقرار ہے مگر آنے والی نسلوں کے لیے جو زادِراہ ولؔی نے قصیدوں کی صورت میں مہیا کیا ہے،اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر ایک رنگ میں جو دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ
ہوا ہوں غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ

سوائے داغ کے پایا نہیں ہوں باغ میں گل
ورائے خون جز نہیں دسا مجھے گل رنگ

رہے بدن پہ طنبورے کے تار گنتی کے
غصے سوں اس پہ جو آ مفلسی نے مارا چنگ

سراؔج اورنگ آبادی صوفی شاعر گزرے ہیں۔غزل گوئی میں ان کا نام ولؔی کے بعد انتہائی احترام سے لیا جاتا ہے۔پروفیسر عبدالقادر سروری نے 'کلیاتِ سراؔج' کے مقدمے میں لکھا ہے:

''قصیدے سے سراؔج کی طبیعت کو مناسبت نہیں تھی۔صرف ایک قصیدہ ان کے کلام میں مل سکا ہے اور خاص ان کے متصوفانہ رنگ میں ہے۔اس میں بھی وہ کسی کی مدح سرائی کے بجائے اپنی کہانی سناتے ہیں۔''

(عبدالقادر سروری (مرتب)،مقدمہ کلیاتِ سراج،قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان،نئی دہلی،۱۹۸۸ء،ص:۱۳۴)

سراؔج کا یہ قصیدہ مختصر ہے اور ۳۰ اشعار پر مشتمل ہے۔موضوع ان کی متصوفانہ طبیعت سے میل کھاتا ہے،البتہ زبان کی سلاست وروانی دکن کے بیش تر شعرا سے بڑھ کر نظر آتی ہے۔چند شعر ملاحظہ کیجیے:

کہاں رفیق موافق کہاں ہے یارِ ندیم
کہ اس کے پاس کرے رسم بندگی تقدیم

مری طرف سیں کہے اس کوں جا کے عرضِ نیاز
پس از نیاز دعا و پس از دعا تسلیم

اے آہ جا کے مری التماس یار سیں کر
کہ زخمِ ہجر سیں میرا جگر ہوا ہے دونیم

دکن میں اُردو قصیدے کی روایت میں ممکن ہے کہ اور بہت سے شعرا کے نام آنے والے دنوں میں شامل ہوں کیوں کہ مورخین نے اس دور کے سینکڑوں ایسے شعرا کا ذکر کیا ہے جن کا کلام دستیاب نہیں ہے۔ اب تک کی بحث سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ دکن میں اُردو قصیدہ کی روایت بہمنی دور سے قائم ہونا شروع ہوئی۔ قلی قطب شاہ نے اسے پروان چڑھایا اور پھر شاہیؔ، غواصیؔ، نصرتیؔ اور ولیؔ جیسے دکنی شعرا نے اس صنف میں جان پھونکی، زبان و بیان کی سطح پر اسے وسعت بخشی، اس کے دخیرۂ الفاظ میں توسیع کی، فارسی قصیدوں کا تتبع کیا، اس میں اپنا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی اور اُردو میں قصیدہ نگاری کے لیے راہ ہموار کی جس سے دکنی زبان کو ترقی ملی۔ قلی قطب شاہ، غواصیؔ، شاہیؔ، نصرتیؔ اور ولیؔ جیسے شعرا نے اپنی فن کاری سے آنے والی نسلوں کو ایک قابلِ ذکر سرمایہ عطا کیا اور انھیں ایسی راہ دکھائی جس پر چل کر اُردو شاعری میں صنفِ قصیدہ کی وہ عمارت تعمیر ہوئی جس کے بلند میناروں میں سوداؔ اور ذوقؔ جیسے قصیدہ گو شاعروں کے نام کندہ ہیں۔

3.3.4 ماحصل

دکن اُردو ادب کا اولین مرکز رہا ہے۔ اُردو شاعری وہیں سے پروان چڑھی اور پھر پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ نظم و نثر کی دیگر اصناف کی طرح دکنی شاعری میں صنفِ قصیدہ کا وجود بھی ملتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ وہاں کے بیش تر شعرا نے قصیدے کی جانب وہ خصوصی توجہ نہ دی، جو مثنوی یا غزل کو حاصل تھی تاہم ان کی پوری شعری روایت میں مدحیہ اشعار اور نظموں کا پتہ ملتا ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ ان شعرا کی طبیعت قصیدہ گوئی سے بے زار نہ تھی بلکہ کچھ دیگر وجوہات کے سبب وہ قصیدہ کو بہ طور صنف برتنے سے عرصے تک دور رہے۔ دکن میں قصائد کے نشانات بہمنی دور سے ملتے ہیں۔ محققین نے اس عہد کے بعض شعرا کے اشعار پیش کیے ہیں۔ البتہ قلی قطب شاہ، شاہیؔ اور نصرتیؔ جیسے عظیم شاعروں نے اس صنف کے حسن کو نکھارنے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال کیا اور طویل قصائد تحریر کیے۔ اگر چہ دکنی شعرا نے مثنوی نگاری اور غزل گوئی کی طرف خاص توجہ دی تھی تاہم بہت سے شعرا قصیدہ گوئی کی طرف بھی مائل ہوئے تھے اور کئی اہم قصیدے ان کی یادگار ہیں۔ ان قصائد کی ادبی قدر و قیمت پر بات ہو سکتی ہے تاہم صنفِ قصیدہ میں اولین نمونے کے طور پر ان کی حیثیت ہمیشہ ہی قابلِ ذکر رہے گی۔ دکن کے بہت سے سلاطین و شعرا صنفِ قصیدہ کو پروان چڑھانے والوں میں شامل رہے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں کئی خاص باتیں ہیں جو آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بنی ہیں۔ دکنی قصائد نے زبان و بیان کی سطح پر انتہائی اہم کام کیا ہے جس کے سبب اُردو کو وہ ذخیرۂ الفاظ مل سکا جس کے استعمال سے ہمارے شعرا نے صنفِ قصیدہ میں کارہائے

نمایاں انجام دیے اور آگے چل کر قصیدہ کی وہ عظیم الشان روایت قائم ہوئی جس کے سبب مرزا محمد رفیع سوداؔ اور شیخ ابراہیم ذوقؔ جیسے باکمال قصیدہ گو شاعر اُردو شاعری کو نصیب ہو سکے۔

3.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- دکن میں اُردو قصیدے کے پس منظر سے واقفیت حاصل کی۔
- دکن کے ابتدائی قصائد سے آگہی حاصل کی۔
- دکن میں اُردو قصیدہ نگاری کی روایت اور اس کے ارتقا سے بحث کی۔
- دکن کے اہم قصیدہ نگاروں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- دکن کی اُردو قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھا۔

3.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ دکن میں ابتدائی عہد میں قصائد کی عدمِ موجودگی کے اسباب بتائیے۔

۲۔ ابتدائی دکنی قصائد سے متعلق اپنی معلومات تحریر کیجیے۔

۳۔ قلی قطب شاہ نے کتنے اور کن موضوعات پر قصیدے تحریر کیے ہیں؟

۴۔ غواصیؔ کی قصیدہ نگاری پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۵۔ نصرتیؔ کی قصیدہ نگاری کے امتیازی پہلوؤں سے بحث کیجیے۔

3.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ دکن میں ابتدائی عہد میں قصائد کی عدم موجودگی کے محققین نے کئی اسباب بیان کیے ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ صنفِ قصیدہ کا بنیادی تعلق مدح سے ہے اور دکن میں بیش تر شعرا یا تو سلاطین تھے یا پھر صوفی و سالک۔ ایسے میں سلاطین کس کی مدح کرتے اور صوفی و سالک شعرا کو کسی بادشاہ یا سلطان کی مدح و ستائش کرنے میں دل چسپی نہیں تھی۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ زبان اپنی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھی، ایسے میں قصیدہ جیسی صنف میں طبع آزمائی کرنا قدرے مشکل امر تھا۔ ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ دکنی سلاطین کا تعلق شیعہ مکتبِ فکر سے تھا۔ اس لیے ان کے نزدیک مرثیوں کی وقعت زیادہ تھی اور

مرثیہ گوئی سے شاہی قرب اور اعزاز و انعام حاصل ہوتا تھا۔اس کے علاوہ سولھویں صدی میں شاعری کا درباری اثر سے محفوظ ہونا یا پھر مثنویوں سے قصیدہ کا کام لینا بھی قصائد کی عدمِ موجودگی کے اسباب میں شامل ہے۔

۲۔ دکن میں قصیدہ گوئی کی روایت کا آغاز مشتاقؔ اور لطفیؔ سے ہوتا ہے جن کے قصائد کے نمونے دستیاب ہیں۔بعض مثنویوں یا دوسری تحریروں میں بھی قصیدے کے عناصر موجود تھے۔مثلاً مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' میں سلطان علاء الدین بہمنی کی مدح میں اشعار ملتے ہیں۔قطب الدین قادری کے 'سیرت نامہ' میں اس کے ممدوح شیخ طریقت محمد ابراہیم مخدوم کی شان میں اشعار کا نذرانہ پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح قطب شاہی دور کے شاعر احمد گجراتی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی مدح میں اشعار ملتے ہیں۔اس لحاظ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر چہ بہ طور صنفِ سخن قصیدے کا رواج دکن میں ابتدائی دنوں میں نہیں ہوسکا تاہم اس دور کی مثنویوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن کو اگر علاحدہ کر کے رکھا جائے تو ان پر قصیدے کا گمان گزرے گا۔

۳۔ قلی قطب شاہ کے کلیات میں کل بارہ قصیدے شامل ہیں جن میں سے چھے نامکمل ہیں۔اس نے حمد و نعت کے ساتھ ساتھ عید، عید قربان، عید میلاد النبی، نوروز اور بسنت جیسے موضوعات پر قصیدے تحریر کیے ہیں۔

۴۔ غواصیؔ کے کلیات میں ۲۱ قصائد شامل ہیں۔حالاں کہ محققین کے مطابق اس کے قلمی نسخے میں ۳۵ قصائد تھے جن میں سے بعض قصائد کو اس کے ناقص الاشعار ہونے یا دیگر شعرا کے کلام کا اشتباہ ہونے کے سبب کلیات میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔وہ با کمال قصیدہ گو رہا ہے جس نے فارسی کے مقبول قصیدہ گو شاعر ظہیرؔ فاریابی اور کمال خجندیؔ وغیرہ کی زمینوں میں قصیدے لکھے اور اپنے تخلیقی جوہر کا کام یاب مظاہرہ کیا۔ غواصیؔ کے یہ تمام قصائد عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں ہیں۔اس نے ایک قصیدہ منقبت علیؓ میں اور ایک قصیدہ باری تعالیٰ کی تحمید میں تحریر کیا ہے، البتہ ان دونوں قصائد میں بھی بادشاہ کی تعریف کا موقع اور جواز نکال لیا ہے۔غواصیؔ کے قصیدے فنِ قصیدہ گوئی پر اس کی دسترس کا ثبوت ہیں۔اس کے قصیدوں کی تشبیب یا گریز میں بھرپور فن کاری نظر آتی ہے۔اس کی مدح سرائی بھی قابلِ تعریف ہے۔اس عنصر میں اس پر فارسی شعرا کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں جو دیگر دکنی شعرا کے یہاں نظر نہیں آتا۔

۵۔ نصرتیؔ کا نام اُردو قصیدہ کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔پروفیسر محمود الٰہی کے مطابق نصرتیؔ نے کل بارہ قصیدے تحریر کیے ہیں۔اس نے مدحیہ قصیدوں کے ساتھ ساتھ ہجویہ قصائد بھی تحریر کیے ہیں۔ عربی قصائد کی طرح اس کے قصیدوں میں بھی جنگ کے واقعات اور مظاہرِ قدرت وغیرہ سے متعلق بہت

سے اشعار ملتے ہیں۔ ماہرینِ فن نے لکھا ہے کہ اس کی مثنوی میں مختلف عنوانات کے ذیل میں درج اشعار کو اگر ایک جگہ مرتب کر دیا جائے تو ایک بہترین قصیدہ تیار ہو جائے گا۔ نصرتی نے موسمِ سرما یا ٹھنڈ کالے پر بھی قصیدہ تحریر کیا ہے جسے بقول پروفیسر محمود الٰہی ''سعدی کے بہاریہ قصیدوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے''۔ دکن میں زیادہ طویل قصیدوں کی روایت نہیں ملتی، البتہ 'علی نامہ' میں مذکور کئی قصائد قدرے طویل ہیں جن میں سو سے زائد اشعار ملتے ہیں۔ فتحِ ملنار پر اس نے ایک قصیدہ تحریر کیا ہے جس میں ۲۲۰ ابیات ہیں۔ اس کے قصائد میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور رزمیہ شاعری کا پہلو انتہائی متاثر کن ہے اور یہ صورت اُردو کے کسی اور قصیدہ گو شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ اکثر ماہرینِ ادب نے نصرتی کے قصائد کی اہمیت و انفرادیت سے بحث کرتے ہوئے اسے اُردوئے قدیم اور دکن کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر قرار دیا ہے۔

3.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
فارس	:	ملکِ ایران کا قدیمی نام
مستعار	:	اُدھار لیا ہوا، مانگا ہوا
تشکیل	:	شکل بنانا، خاکہ تیار کرنا، شکل دینا
اُفق	:	آسمان کا وہ کنارہ جو زمین سے ملا ہوا دکھائی دیتا ہے
نوروز	:	ایرانیوں کے سال کے پہلے دن کا تہوار
تخئیل	:	خیال یا تصور کرنے کا عمل، خیال
علمِ نجوم	:	ستاروں کی گردش کا علم
علمِ رمل	:	غیب دانی کا علم، وہ علم جس میں لکیروں اور ہندسوں کے ذریعے غیب کی بات بتائی جاتی ہے
طریقت	:	دل کی پاکیزگی، تصوف، صوفیائے کرام کے مسلک کا نام جس میں عشقِ الٰہی کو تمام عبادات پر فوقیت حاصل ہے
پُرشکوہ	:	عظیم الشان، شان و شوکت والا
وقعت	:	مرتبہ، قدر، عظمت، حیثیت
مفقود	:	کھویا ہوا، غائب، ندارد، ناپید
دوازدہ	:	بارہ، دس اور دو کا مجموعہ
تحمید	:	الحمدللہ کہنا، تعریف، حمد، ستائش اور حمد کرنے کا عمل

بابت : بارے میں، باب میں، متعلق

3.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اُردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ : پروفیسر محمود الٰہی

۲۔ اُردو قصیدہ نگاری (مرتبہ) : ڈاکٹر اُمِّ ہانی اشرف

۳۔ دکن میں اُردو : نصیر الدین ہاشمی

۴۔ قصیدہ کا فن اور اُردو قصیدہ نگاری : ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین

۵۔ اُردو میں قصیدہ نگاری : ڈاکٹر ابو محمد سحر

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY